تفہیم القرآن

الواقعہ

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْوَاقِعَہ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | حضرت عبداللہ بن عباس نے سورتوں کی جو ترتیبِ نزول بیان کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی، پھر الواقعہ اور اس کے بعد الشعراء (الاتقان للسیوطی)۔ یہی ترتیب عکرمہ نے بھی بیان کی ہے (بیہقی، دلائل النبوۃ)

اس کی تائید اُس قصّے سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بارے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب حضرت عمر اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے تو سورۂ طٰہٰ پڑھی جا رہی تھی۔ اُن کی آہٹ سُن کر اِن لوگوں نے قرآن کے اوراق چھپا دیئے۔ حضرت عمرؓ پہلے تو بہنوئی پر پل پڑے اور جب بہن اُن کو بچانے آئیں تو اُن کو بھی مارا یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ بہن کا خون بہتے دیکھ کر حضرت عمرؓ کو سخت ندامت ہوئی اور انہوں نے کہا، اچھا مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم نے چھپا لیا ہے۔ دیکھوں تو سہی اس میں کیا لکھا ہے۔ بہن نے کہا "آپ اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہیں، واللہ لا یمسّہا الا المطاھر، اس صحیفے کو صرف طاہر آدمی ہی ہاتھ لگا سکتا ہے"۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا اور پھر اس صحیفے کو لے کر پڑھا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اُس وقت سورۂ واقعہ نازل ہو چکی تھی، کیونکہ اسی میں آیت لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ وارد ہوئی ہے اور یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ ہجرتِ حبشہ کے بعد ۵ نبوی میں ایمان لائے ہیں۔

موضوع اور مضمون | اِس کا موضوع آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفارِ مکہ کے شبہات کی تردید ہے۔ وہ سب سے زیادہ جس چیز کو ناقابلِ یقین قرار دیتے تھے وہ یہ تھی کہ کبھی قیامت برپا ہوگی

جس میں زمین و آسمان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ بلا اٹھائے جائیں گے اور اُن کا محاسبہ ہوگا اور نیک انسان جنت کے باغوں میں رکھے جائیں گے اور گناہ گار انسان دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ سب خیالی باتیں ہیں جن کا عالمِ واقعہ میں پیش آنا غیر ممکن ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ جب وہ واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ پیش نہیں آیا ہے، نہ کسی کی یہ طاقت ہوگی کہ اسے آنے سے روک دے، یا واقعہ سے غیر واقعہ بنا دے۔ اُس وقت لازماً تمام انسان تین طبقات میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک، سابقین۔ دوسرے، عام صالحین۔ تیسرے وہ لوگ جو آخرت کے منکر رہے اور مرتے دم تک کفر و شرک اور گناہِ کبیرہ پر جمے رہے۔ اِن تینوں طبقات کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسے تفصیل کے ساتھ آیت ۷ سے ۵۶ تک بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد آیت ۵۷ سے ۷۴ تک اسلام کے اُن دونوں بنیادی عقائد کی صداقت پر پے در پے دلائل دیئے گئے ہیں جن کو ماننے سے کفار انکار کر رہے تھے، یعنی توحید اور آخرت۔ اِن دلائل میں زمین و آسمان کی دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی طرف اور اُس غذا کی طرف جسے وہ کھاتا ہے اور اُس پانی کی طرف جسے وہ پیتا ہے اور اس آگ کی طرف جس سے وہ اپنا کھانا پکاتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے اور اسے اس سوال پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ تو جس خدا کے بنانے سے بنا ہے اور جس کے دیئے ہوئے سامانِ زیست پر پل رہا ہے اس کے مقابلے میں خود مختار ہونے، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی بجا لانے کا آخر تجھے حق کیا ہے؟ اور اس کے متعلق تو نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ وہ ایک دفعہ تجھے وجود میں لے آنے کے بعد ایسا عاجز و درماندہ ہو جاتا ہے کہ دوبارہ تجھ کو وجود میں لانا چاہے بھی تو نہیں لا سکتا؟

پھر آیت ۷۵ سے ۸۲ تک قرآن کے بارے میں ان کے شکوک کی تردید کی گئی ہے اور ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ بدنصیبو، یہ عظیم الشان نعمت تمہارے پاس آئی ہے اور تم نے اپنا حصہ اس نعمت میں یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے الٹی بے انصافی

برتتے ہو۔ قرآن کی صداقت پر دو مختصر سے فقروں میں یہ بے نظیر دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس پر کوئی غور کرے تو اس کے اندر ویسا ہی محکم نظام پائے گا جیسا کائنات کے تاروں اور سیاروں کا نظام محکم ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مصنف وہی ہے جس نے کائنات کا یہ نظام بنایا ہے۔ پھر کفار سے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب اُس نوشتۂ تقدیر میں ثبت ہے جو مخلوقات کی دست رس سے باہر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شیاطین لاتے ہیں حالانکہ لوحِ محفوظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس ذریعہ سے یہ پہنچتی ہے اس میں پاک نفس فرشتوں کے سوا کسی کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

آخر میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ تو کتنی ہی من مانیاں کر لے اور اپنی خود مختاری کے گھمنڈ میں کتنا ہی حقائق کی طرف سے اندھا ہو جائے، مگر موت کا وقت تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اُس وقت تو بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اپنے ماں باپ کو نہیں بچا سکتا۔ اپنی اولاد کو نہیں بچا سکتا۔ اپنے پیروں اور پیشواؤں اور محبوب ترین لیڈروں کو نہیں بچا سکتا۔ سب تیری آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں اور تو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی بالاتر طاقت تیرے اوپر فرمانروا نہیں ہے اور تیرا یہ زعم درست ہے کہ دنیا میں بس تو ہی تو ہے، کوئی خدا نہیں ہے، تو کسی مرنے والے کی نکلتی ہوئی جان کو پلٹا کیوں نہیں لاتا؟ جس طرح تو اس معاملہ میں بے بس ہے اُسی طرح خدا کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا کو بھی روک دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ تو خواہ مانے یا نہ مانے۔ موت کے بعد ہر مرنے والا اپنا انجام دیکھ رہے گا۔ مقربین میں سے ہو تو مقربین کا انجام دیکھے گا۔ صالحین میں سے ہو تو صالحین کا انجام دیکھے گا۔ اور جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو وہ انجام دیکھے گا جو ایسے مجرموں کے لیے مقدر ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا[1]۔ وہ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی[2]۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی[3] اور پہاڑ اس طرح ریزہ

---

[1] اِس فقرے سے کلام کا آغاز خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اُن باتوں کا جواب ہے جو اُس وقت کفار کی مجلسوں میں قیامت کے خلاف بنائی جا رہی تھیں۔ زمانہ وہ تھا جب مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نئی نئی اسلام کی دعوت سن رہے تھے۔ اُس میں جو چیز انہیں سب سے زیادہ عجیب اور بعید از عقل و امکان نظر آتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک روز زمین و آسمان کا یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں سب اگلے پچھلے مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات سُن کر حیرت سے اُن کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ آخر یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ چاند، یہ سورج کہاں چلے جائیں گے؟ صدیوں کے گڑے مُردے کیسے جی اٹھیں گے؟ مرنے کے بعد دوسری زندگی، اور پھر اس میں بہشت کے باغ اور جہنم کی آگ، آخر یہ خواب و خیال کی باتیں عقل و ہوش رکھتے ہوئے ہم کیسے مان لیں؟ یہی چہ میگوئیاں اُس وقت مکہ میں ہر جگہ ہو رہی تھیں۔ اِس پس منظر میں فرمایا گیا ہے کہ جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی اُسے جھٹلانے والا نہ ہوگا۔

اِس ارشاد میں قیامت کے لیے "واقعہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی قریب قریب وہی ہیں جس کے لیے اُردو زبان میں ہونی شُدنی کے الفاظ بولے جاتے ہیں، یعنی وہ ایسی چیز ہے جسے لازماً پیش آکر ہی رہنا ہے۔ پھر اس کے پیش آنے کو "وَقَعَت" کہا گیا ہے جو عربی زبان میں کسی بُرے حادثہ کے اچانک برپا ہو جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لَیْسَ لِوَقْعَتِہَا کَاذِبَۃٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے وقوع کا ٹل جانا اور اس کا آتے آتے رُک جانا اور اُس کی آمد کا پھیر دیا جانا ممکن نہ ہوگا، یا بالفاظ دیگر کوئی طاقت پھر اُس کو واقعہ سے غیر واقعہ بنا دینے والی نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ کوئی متنفس اُس وقت یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔

[2] اصل الفاظ ہیں خافضۃ رافعۃ "گرانے والی اور اٹھانے والی"۔ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا

ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔
تم لوگ اُس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے[۴]:
دائیں بازو والے[۵]، سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔
اور بائیں بازو والے[۶]، تو بائیں بازو والوں (کی بدنصیبی) کا کیا ٹھکانا۔

ہے کہ وہ سب کچھ اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی۔ نیچے کی چیزیں اوپر اور اوپر کی چیزیں نیچے ہو جائیں گی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانے والی اور اُٹھے ہوئے لوگوں کو گرانے والی ہوگی، یعنی اس کے آنے پر انسانوں کے درمیان عزت و ذلت کا فیصلہ ایک دوسری ہی بنیاد پر ہوگا۔ جو دنیا میں عزت والے بنے پھرتے تھے وہ ذلیل ہو جائیں گے اور جو ذلیل سمجھے جاتے تھے وہ عزت پائیں گے۔

[۳] یعنی وہ کوئی مقامی زلزلہ نہ ہوگا جو کسی محدود علاقے میں آئے، بلکہ پوری کی پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی۔ اُس کو یک لخت ایک زبردست جھٹکا لگے گا جس سے وہ لرز کر رہ جائے گی۔

[۴] خطاب اگرچہ بظاہر اُن لوگوں سے ہے جنہیں یہ کلام سنایا جا رہا تھا، یا جو اب اِسے پڑھیں یا سُنیں، لیکن دراصل پوری نوع انسانی اس کی مخاطب ہے۔ تمام انسان جو اول روز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہیں وہ سب آخر کار تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

[۵] اصل میں لفظ اصحاب المَیمنہ استعمال ہوا ہے۔ مَیمنہ عربی قاعدے کے مطابق یَمین سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں، اور یُمن سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی ہیں فالِ نیک۔ اگر اس کو یمین سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہونگے "سیدھے ہاتھ والے"۔ لیکن اس سے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب ہے عالی مرتبہ لوگ۔ اہلِ عرب سیدھے ہاتھ کو قوت اور رفعت اور عزت کا نشان سمجھتے تھے۔ جس کا احترام مقصود ہوتا تھا اُسے مجلس میں سیدھے ہاتھ پر بٹھاتے تھے۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے تو کہتے فلانٌ مِنّی بالیمین "وہ تو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف ہے"۔ اُردو میں بھی کسی شخص کو کسی بڑی ہستی کا دستِ راست اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُس کا خاص آدمی ہے۔ اور اگر اس کو یُمن سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہونگے خوش نصیب اور نیک بخت لوگ۔

اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں۔ وہی تو مقرّب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنّتوں میں رہیں گے۔

؎ اصل میں لفظ اصحاب المشئمہ استعمال ہُوا ہے۔ مَشئمہ، شُؤم سے ہے جس کے معنی بدبختی، نحوست اور بدفالی کے ہیں۔ اور عربی زبان میں بائیں ہاتھ کو بھی شُؤمیٰ کہا جاتا ہے۔ اردو میں شومیٔ قسمت اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ اہلِ عرب شمال (بائیں ہاتھ) اور شُؤم (فالِ بد) کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں بایاں ہاتھ کمزوری اور ذلّت کا نشان تھا۔ سفر کو جاتے ہوئے اگر پرندہ اڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف جاتا تو وہ اس کو بُری فال سمجھتے تھے۔ کسی کو اپنے بائیں ہاتھ بٹھاتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اسے کمتر درجے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہو کہ میرے ہاں اس کی کوئی عزت نہیں تو کہا جاتا کہ فلان منی بالشمال "وہ میرے بائیں ہاتھ کی طرف ہے"۔ اُردو میں بھی کسی کام کو بہت ہلکا اور آسان قرار دینا ہو تو کہا جاتا ہے یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پس اصحاب المشئمہ سے مراد ہیں بدبخت لوگ، یا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلّت سے دوچار ہوں گے اور دربارِ الٰہی میں بائیں طرف کھڑے کیے جائیں گے۔

؎ سابقین (آگے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی اور حق پرستی میں سب پر سبقت لے گئے ہوں، بھلائی کے ہر کام میں سب سے آگے ہوں، خدا اور رسُول کی پکار پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے ہوں، جہاد کا معاملہ ہو یا انفاق فی سبیل اللہ کا یا خدمتِ خلق کا یا دعوتِ خیر اور تبلیغِ حق کا، غرض دنیا میں بھلائی پھیلانے اور برائی مٹانے کے لیے ایثار و قربانی اور محنت و جانفشانی کا جو موقع بھی پیش آئے اس میں وہی آگے بڑھ کر کام کرنے والے ہوں۔ اس بنا پر آخرت میں بھی سب سے آگے وہی رکھے جائیں گے۔ گویا وہاں اللہ تعالیٰ کے دربار کا نقشہ یہ ہوگا کہ دائیں بازو میں صالحین، بائیں بازو میں فاسقین، اور سب سے آگے بارگاہِ خداوندی کے قریب سابقین۔ حدیث میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا "جانتے ہو قیامت کے روز کون لوگ سب سے پہلے پہنچ کر اللہ کے سایہ میں جگہ پائیں گے؟" لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اللہ کا رسول ہی زیادہ جانتا ہے۔ فرمایا الذین اذا اعطوا الحق قبلوہ، واذا سئلوہ بذلوہ، وحکموا للناس کحکمہم لانفسہم "وہ جن کا حال یہ تھا کہ جب ان کے آگے حق پیش کیا گیا انہوں نے قبول کر لیا، جب ان سے حق مانگا گیا انہوں نے ادا کر دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں ان کا

اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم۔[۹] مرصّع تختوں پر تکیے لگاتے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ اُن کی مجلسوں میں اَبَدی لڑکے[۱۰] شرابِ چشمۂ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لیے دوڑتے پھرتے ہونگے جسے

فیصلہ وہی کچھ تھا جو خود اپنی ذات کے معاملہ میں تھا" (مُسند احمد)

[۹] مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اوّلین اور آخرین یعنی اگلوں اور پچھلوں سے مُراد کون ہیں؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جتنی اُمتیں گزری ہیں وہ اوّلین ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قیامت تک کے لوگ آخرین ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بعثت محمدی سے پہلے ہزارہا برس کے دوران میں جتنے انسان گزرے ہیں اُن کے سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور حضورؐ کی بعثت کے بعد سے قیامت تک آنے والے انسانوں میں سے جو لوگ سابقین کا مرتبہ پائیں گے اُن کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں اوّلین و آخرین سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اوّلین و آخرین ہیں۔ یعنی آپ کی امت میں ابتدائی دَور کے لوگ اوّلین ہیں جن میں سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور بعد کے لوگ آخرین ہیں جن میں سابقین کی تعداد کم ہوگی۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد ہر نبی کی امت کے اوّلین و آخرین ہیں، یعنی ہر نبی کے ابتدائی پیرووں میں سابقین بہت ہونگے اور بعد کے آنے والوں میں وہ کم پائے جائیں گے۔ آیت کے الفاظ اِن تینوں مفہوموں کے حامل ہیں اور بعید نہیں کہ یہ تینوں ہی صحیح ہوں، کیونکہ درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اِن کے علاوہ ایک اور مطلب بھی ان الفاظ سے نکلتا ہے اور وہ بھی صحیح ہے کہ ہر پہلے دَور میں انسانی آبادی کے اندر سابقین کا تناسب زیادہ ہوگا اور بعد کے دَور میں ان کا تناسب کم نکلے گا۔ اس لیے کہ انسانی آبادی جس رفتار سے بڑھتی ہے، سبقت فی الخیرات کرنے والوں کی تعداد اُسی رفتار سے نہیں بڑھتی۔ گنتی کے اعتبار سے یہ لوگ چاہے پہلے دَور کے سابقین سے تعداد میں زیادہ ہوں، لیکن بحیثیت مجموعی دنیا کی آبادی کے مقابلے میں ان کا تناسب گھٹتا ہی چلا جاتا ہے۔

[۱۰] اس سے مراد ہیں ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اُن کی عمر ہمیشہ ایک ہی حالت پر ٹھیری رہے گی۔ حضرت علیؓ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اہلِ دنیا کے وہ بچے ہیں جو بالغ ہونے سے پہلے مر گئے، اس لیے نہ ان کی کچھ نیکیاں ہونگی کہ ان کی جزا پائیں اور نہ بدیاں ہونگی کہ ان کی سزا پائیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس سے مُراد صرف وہی اہلِ دنیا ہو سکتے ہیں جن کو جنت نصیب نہ ہوئی ہو۔ رہے مومنین صالحین، تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ

پی کر نہ اُن کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا[۱۰]۔ اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چُن لیں، اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں[۱۱]۔ اور ان کے لیے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہونگی، ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی[۱۲]۔ یہ سب کچھ اُن اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سُنیں گے[۱۳]۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ہوگی[۱۴]۔

نے خود قرآن میں یہ ضمانت دی ہے کہ اُن کی ذریت ان کے ساتھ جنت میں لا ملائی جائے گی (الطور، آیت ۲۱)۔ ایسی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو ابو داؤد طیالسی، طَبَرانی اور بَزّار نے حضرت انسؓ اور حضرت سَمُرہ بن جُندُب سے نقل کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مشرکین کے بچے اہلِ جنت کے خادم ہونگے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۶- الطور، حاشیہ ۱۹)

۱۰؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۲۷- سورۂ محمد، حاشیہ ۲۲- الطور حاشیہ ۱۸-

۱۱؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ طور، حاشیہ ۱۷-

۱۲؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافّات حاشیہ ۲۸-۲۹- الدخان، حاشیہ ۴۲- الرحمٰن، حاشیہ ۵۱-

۱۳؎ یہ جنت کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے، جسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، کہ انسان کے کان وہاں بیہودگی، یاوہ گوئی، جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان، گالی، لاف و گزاف، طنز و تمسخر اور طعن و تشنیع کی باتیں سننے سے محفوظ ہونگے۔ وہ بدزبان اور بدتمیز لوگوں کی سوسائٹی نہ ہوگی جس میں لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالیں۔ وہ شریف اور مہذب لوگوں کا معاشرہ ہوگا جس کے اندر یہ لغویات ناپید ہونگی۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے کچھ بھی شائستگی اور مذاقِ سلیم سے نوازا ہو تو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دنیوی زندگی کا یہ کتنا بڑا عذاب ہے جس سے انسان کو جنت میں نجات پانے کی امید دلائی گئی ہے۔

۱۴؎ اصل الفاظ ہیں اِلّا قِیلًا سَلامًا سَلامًا۔ بعض مفسرین و مترجمین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ

اور دائیں بازو والے، دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ وہ بے خار بیریوں[۱۵]، اور تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں، اور دُور تک پھیلی ہوئی چھاؤں، اور ہر دم رواں پانی، اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں[۱۶]، اور اونچی نشست گاہوں میں ہونگے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے[۱۷]، اپنے شوہروں کی عاشق[۱۸] اور عمر میں ہم سن[۱۹]۔

وہاں ہر طرف سلام سلام ہی کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ہے قولِ سلیم، یعنی ایسی گفتگو جو عیوب کلام سے پاک ہو، جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو پچھلے فقرے میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں سلام کا لفظ قریب قریب اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے انگریزی میں لفظ SANE استعمال ہوتا ہے۔

۱۵؎ یعنی ایسی بیریاں جن کے درختوں میں کانٹے نہ ہونگے۔ ایک شخص تعجب کا اظہار کر سکتا ہے کہ بیر ایسا کونسا نفیس پھل ہے جس کے جنت میں ہونے کی خوشخبری سنائی جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنت کے بیروں کا تو کیا ذکر، خود اس دنیا کے بھی بعض علاقوں میں یہ پھل اتنا لذیذ، خوشبودار اور میٹھا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ منہ کو لگنے کے بعد اسے چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور بیر جتنے اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں، ان کے درختوں میں کانٹے اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔ اسی لیے جنت کے بیروں کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ان کے درخت بالکل ہی کانٹوں سے خالی ہونگے، یعنی ایسی بہترین قسم کے ہونگے جو دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

۱۶؎ اصل الفاظ ہیں لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ۔ لامقطوعہ سے مراد یہ ہے کہ یہ پھل نہ موسمی ہونگے کہ موسم گزر جانے کے بعد وہ نہ مل سکیں، نہ ان کی پیداوار کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا کہ کسی باغ کے سارے پھل اگر توڑ لیے جائیں تو ایک مدت تک وہ بے ثمر رہ جائے، بلکہ ہر پھل وہاں ہر موسم میں ملے گا اور خواہ کتنا ہی کھایا جائے لگاتار پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ اور لا ممنوعہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے باغوں کی طرح وہاں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی، نہ پھلوں کے توڑنے اور کھانے میں کوئی امر مانع ہوگا کہ درختوں پر کانٹے ہونے یا زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے توڑنے میں کوئی زحمت پیش آئے۔

۱۷؎ اس سے مراد دنیا کی وہ نیک خواتین ہیں جو اپنے ایمان و عملِ صالح کی بنا پر جنت میں جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو وہاں جوان بنا دیگا، خواہ وہ کتنی ہی بوڑھی ہو کر مری ہوں۔ نہایت خوبصورت بنا دیگا، خواہ دنیا میں

حسین رہی ہوں یا نہ رہی ہوں - باکرہ بنا دیگا ۔ خواہ دنیا میں وہ کنواری مری ہوں یا بال بچوں والی ہو کر - ان کے شوہر بھی اگر ان کے ساتھ جنت میں پہنچیں گے تو وہ ان سے ملا دی جائیں گی ، ورنہ اللہ تعالیٰ کسی اور جنتی سے ان کو بیاہ دیگا -
اس آیت کی یہی تشریح متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے - شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ ایک بڑھیا نے حضورؐ سے عرض کیا میرے حق میں جنت کی دعا فرمائیں - آپ نے فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہ ہوگی - وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ "اُسے بتاؤ ، وہ بڑھاپے کی حالت میں داخلِ جنت نہیں ہوگی ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم انہیں خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور باکرہ بنا دینگے"
ابن ابی حاتم نے حضرت سلمہ بن یزید کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے اس آیت کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا "اس سے مراد دنیا کی عورتیں ہیں ، خواہ وہ باکرہ مری ہوں یا شادی شدہ" طبرانی میں حضرت ام سلمہ کی ایک طویل روایت ہے جس میں وہ جنت کی عورتوں کے متعلق قرآن مجید کے مختلف مقامات کا مطلب حضورؐ سے دریافت فرماتی ہیں - اس سلسلہ میں حضورؐ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ھُنّ اللّواتی قبضن فی دار الدنیا عجائز رمصا شمطا خلقھن اللہ بعد الکبر فجعلھن عذاریٰ " یہ وہ عورتیں ہیں جو دنیا کی زندگی میں مری ہیں - بوڑھی پھونس ، آنکھوں میں چیپڑ ، سر کے بال سفید - اس بڑھاپے کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو پھر سے باکرہ پیدا کردے گا" حضرت ام سلمہ پوچھتی ہیں اگر کسی عورت کے دنیا میں کئی شوہر رہ چکے ہوں اور وہ سب جنت میں جائیں تو وہ ان میں سے کس کو ملے گی ؟ حضور فرماتے ہیں انھا تخیّر فتختار احسنھم خلقا فتقول یا رب ان ھٰذا کان احسن خلقاً معی فزوجنیہا ، یا ام سلمہ ، ذھب حسن الخلق بخیر الدنیا والآخرۃ " اس کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جسے چاہے چُن لے ، اور وہ اُس شخص کو چُنے گی جو ان میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق کا تھا - وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گی کہ اے رب ، اس کا برتاؤ میرے ساتھ سب سے اچھا تھا اس لیے مجھے اسی کی بیوی بنا دے - اے ام سلمہ ، حسنِ اخلاق دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی لوٹ لے گیا ہے" (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ، تفسیر سورۂ رحمٰن ، حاشیہ ۵)

شلہ اصل میں لفظ عُرُبًا استعمال ہوا ہے - یہ لفظ عربی زبان میں عورت کی بہترین نسوانی خوبیوں کے لیے بولا جاتا ہے - اس سے مراد ایسی عورت ہے جو طرحدار ہو ، خوش اطوار ہو ، خوش گفتار ہو ، نسوانی جذبات سے

یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لیے ہے۔ وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہونگے اور پچھلوں میں سے بھی بہت۔ ع۱
اور بائیں بازو والے، بائیں بازو والوں کی بد نصیبی کا کیا پوچھنا۔ وہ لُو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے
پانی اور کالے دھوئیں کے سایے میں ہونگے جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہونگے جو اس انجام کو
پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے
اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی
اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟" اے نبی، ان لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک
دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔ پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو،

بریز ہو، اپنے شوہر کو دل و جان سے چاہتی ہو، اور اس کا شوہر بھی اس کا عاشق ہو۔

۲۹ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہونگی۔ دوسرا یہ کہ وہ آپس میں ہم سن ہونگی، یعنی تمام جنتی عورتیں ایک ہی عمر کی ہونگی اور ہمیشہ اسی عمر کی رہیں گی۔ بعید نہیں کہ یہ دونوں ہی باتیں بیک وقت صحیح ہوں، یعنی یہ خواتین خود بھی ہم سن ہوں اور ان کے شوہر بھی ان کے ہم سن بنا دیئے جائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ یدخل اھل الجنۃ الجنۃ جرداً مرداً بیضاً جعاداً مکحلین ابناء ثلاث وثلاثین "اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہونگے تو ان کے جسم بالوں سے صاف ہونگے، مسیں بھیگ رہی ہونگی مگر ڈاڑھی نہ نکلی ہوگی۔ گورے چٹے ہونگے۔ گٹھے ہوئے بدن ہونگے۔ آنکھیں سرمگیں ہونگی۔ سب کی عمریں ۳۳ سال کی ہونگی" (مسند احمد، مرویات ابی ہریرہ)۔ قریب قریب یہی مضمون ترمذی میں حضرت مُعاذ بن جَبَل اور حضرت ابو سعید خُدریؓ سے بھی مروی ہے۔

۳۰ یعنی خوشحالی نے ان پر اُلٹا اثر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کے بجائے وہ اُلٹے کافرِ نعمت ہو گئے تھے۔ اپنی لذاتِ نفس میں منہمک ہو کر خُدا کو بھول گئے تھے۔ اور گناہِ عظیم پر مصر تھے۔ "گناہِ عظیم" کا لفظ جامع ہے۔ اس سے مراد کفر و شرک اور دہریت بھی ہے اور اخلاق و اعمال کا ہر بڑا گناہ بھی۔

تم شجرِ زقّوم[۲۱] کی غذا کھانے والے ہو۔ اُسی سے تم پیٹ بھروگے اور اُوپر سے کھولتا ہُوا پانی تونس لگے ہوتے اونٹ کی طرح پیوگے۔ یہ ہے بائیں بازو والوں کی ضیافت کا سامان روزِ جزا میں۔

ہم نے تمہیں[۲۲] پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟[۲۳] کبھی تم نے غور کیا، یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو، اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟[۲۴] ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے[۲۵]

۲۱؎ زقّوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۳۴۔

۲۲؎ یہاں سے آیت ۷۴ تک جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان میں بیک وقت آخرت اور توحید، دونوں پر استدلال کیا گیا ہے۔ چونکہ مکّہ کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم کے ان دونوں بنیادی اجزاء پر معترض تھے اس لیے یہاں دلائل اِس انداز سے دیئے گئے ہیں کہ آخرت کا ثبوت بھی ان سے ملتا ہے اور توحید کی صداقت کا بھی۔

۲۳؎ یعنی اِس بات کی تصدیق کہ ہم ہی تمہارے رب اور معبود ہیں، اور ہم تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

۲۴؎ اس مختصر سے فقرے میں ایک بڑا اہم سوال انسان کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام دوسری چیزوں کو چھوڑ کر انسان اگر صرف اِسی ایک بات پر غور کرے کہ وہ خود کس طرح پیدا ہُوا ہے تو اسے نہ قرآن کی تعلیمِ توحید میں کوئی شک رہ سکتا ہے نہ اس کی تعلیمِ آخرت میں۔ انسان آخر اسی طرح تو پیدا ہوتا ہے کہ مرد اپنا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر کیا اس نطفہ میں بچہ پیدا کرنے کی، اور لازمًا انسان ہی کا بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت آپ سے آپ پیدا ہو گئی ہے؟ یا انسان نے خود پیدا کی ہے؟ یا خدا کے سوا کسی اور نے پیدا کر دی ہے؟ اور کیا یہ مرد کے، یا عورت کے، یا دنیا کی کسی طاقت کے اختیار میں ہے کہ اس نطفے سے حمل کا استقرار کرا دے؟ پھر استقرارِ حمل سے وضعِ حمل تک ماں کے پیٹ میں بچے کی درجہ بدرجہ تخلیق و پرورش، اور ہر بچے کی الگ صورت گری اور ہر بچے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک خاص شخصیت کا انسان بن کر اٹھے، کیا یہ سب کچھ ایک خدا کے سوا کسی اور کا کام ہے؟ کیا اس میں کسی اور کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل ہے؟ کیا یہ کام ماں باپ خود کرتے ہیں؟ یا کوئی ڈاکٹر کرتا ہے؟ یا وہ انبیاء اور اولیاء کرتے ہیں جو خود اسی طرح پیدا ہوئے ہیں؟ یا سورج اور چاند اور تارے کرتے ہیں جو خود ایک قانون کے غلام ہیں؟ یا وہ فطرت کرتی ہے جو بجائے خود علم، حکمت، ارادے اور اختیار سے عاری ہے؟ پھر کیا یہ فیصلہ کرنا بھی خدا کے سوا کسی کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکی ہو

یا لڑکا؛ خوبصورت ہو یا بدصورت؛ طاقتور ہو یا کمزور؛ اندھا بہرا لنگڑا لولا ہو یا سمیع الاعضاء؛ ذہین ہو یا کند ذہن؟ پھر کیا خدا کے سوا کوئی اور یہ طے کرتا ہے کہ قوموں کی تاریخ میں کس وقت کس قوم کے اندر کن اچھی یا بری صلاحیتوں کے آدمی پیدا کرے جو اسے عروج پر لے جائیں یا زوال کی طرف دھکیل دیں؛ اگر کوئی شخص ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا نہ ہو تو وہ خود محسوس کرے گا کہ شرک یا دہریت کی بنیاد پر ان سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ان کا معقول جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان پورا کا پورا خدا کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے ساختہ و پرداختہ اس انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنے خالق کے مقابلے میں آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے؛ یا اس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی بجا لائے؛

توحید کی طرح یہ سوال آخرت کے معاملہ میں بھی فیصلہ کن ہے۔ انسان کی تخلیق ایک ایسے کیڑے سے ہوتی ہے جو طاقتور خوردبین کے بغیر نظر تک نہیں آسکتا۔ یہ کیڑا عورت کے جسم کی تاریکیوں میں کسی وقت اُس نسوانی انڈے سے جا ملتا ہے جو اسی کی طرح ایک حقیر سا خوردبینی وجود ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک بچھوٹا سا زندہ خلیہ بن جاتا ہے جو حیاتِ انسانی کا نقطۂ آغاز ہے، اور یہ خلیہ بھی اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین کے بغیر اس کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس ذرا سے خلیے کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ ۹ مہینے چند روز کے اندر رحمِ مادر میں ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیتا ہے، اور جب اس کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو ماں کا جسم خود ہی اسے دھکیل کر دنیا میں اودھم مچانے کے لیے باہر پھینک دیتا ہے۔ تمام انسان اسی طرح دنیا میں آئے ہیں اور شب و روز اپنے ہی جیسے انسانوں کی پیدائش کا یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ اِس کے بعد صرف ایک عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ جو خدا اِس طرح انسانوں کو آج پیدا کر رہا ہے وہ کل کسی وقت اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اِن انسانوں کو دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا۔

۲۵؎ یعنی تمہاری پیدائش کی طرح تمہاری موت بھی ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم یہ طے کرتے ہیں کہ کس کو ماں کے پیٹ ہی میں مر جانا ہے، اور کسے پیدا ہوتے ہی مر جانا ہے، اور کسے کس عمر تک پہنچ کر مرنا ہے۔ جس کی موت کا جو وقت ہم نے مقدر کر دیا ہے اس سے پہلے دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی، اور اس کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔ مرنے والے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کی آنکھوں کے

اور ہم اِس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔[۲۶] اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہو، پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟[۲۷]

سامنے مرتے ہیں، بلکہ ڈاکٹر خود بھی اپنے وقت پر مر جاتے ہیں۔ کبھی کوئی نہ موت کے وقت کو جان سکا ہے، نہ آتی ہوئی موت کو روک سکا ہے، نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ کس کی موت کس ذریعہ سے، کہاں، کس طرح واقع ہونے والی ہے۔

۲۶؎ یعنی جس طرح ہم اس سے عاجز نہ تھے کہ تمہیں تمہاری موجودہ شکل و ہیئت میں پیدا کریں، اسی طرح ہم اس سے بھی عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری تخلیق کا طریقہ بدل کر کسی اور شکل و ہیئت میں، کچھ دوسری صفات و خصوصیات کے ساتھ تم کو پیدا کر دیں۔ آج تم کو ہم اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ تمہارا نطفہ قرار پاتا ہے اور تم ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ بن کر ایک بچہ کی صورت میں برآمد ہوتے ہو۔ یہ طریق تخلیق بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا ہے۔ مگر ہمارے پاس بس یہی ایک ہی بندھا طریقہ نہیں ہے جس کے سوا ہم کوئی اور طریقہ نہ جانتے ہوں، یا نہ عمل میں لا سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم تمہیں اُسی عمر کے انسان کی شکل میں پیدا کر سکتے ہیں جس عمر میں تم مرے تھے۔ آج تمہاری بینائی، سماعت اور دوسرے حواس کا پیمانہ ہم نے کچھ اور رکھا ہے۔ مگر ہمارے پاس انسان کے لیے بس یہی ایک پیمانہ نہیں ہے جسے ہم بدل نہ سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم اسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دینگے یہاں تک کہ تم وہ کچھ دیکھ اور سن سکو گے جو یہاں نہیں دیکھ سکتے اور نہیں سُن سکتے۔ آج تمہاری کھال اور تمہارے ہاتھ پاؤں اور تمہاری آنکھوں میں کوئی گویائی نہیں ہے۔ مگر زبان کو بولنے کی طاقت ہم ہی نے تو دی ہے۔ ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ قیامت کے روز تمہارا ہر عضو اور تمہارے جسم کی کھال کا ہر ٹکڑا ہمارے حکم سے بولنے لگے۔ آج تم ایک خاص عمر تک ہی جیتے ہو اور اس کے بعد مر جاتے ہو۔ یہ تمہارا جینا اور مرنا بھی ہمارا ہی مقرر کردہ ایک قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کل ہم ایک دوسرا قانون تمہاری زندگی کے لیے بنا سکتے ہیں جس کے تحت تمہیں کبھی موت نہ آئے۔ آج تم ایک خاص حد تک ہی عذاب برداشت کر سکتے ہو، جس سے زائد عذاب اگر تمہیں دیا جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضابطہ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ کل ہم تمہارے لیے ایک دوسرا ضابطہ بنا سکتے ہیں جس کے

کبھی تم نے سوچا، یہ بیج جو تم بوتے ہو، اِن سے کھیتیاں تم اُگاتے ہو یا اُن کے اُگانے والے ہم ہیں؟[۲۵] ہم چاہیں تو ان کھیتیوں کو بھُس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو اُلٹی چَٹی پڑ گئی، بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔

کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے ہو، اِسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے

تحت تم ایسا عذاب ایسی طویل مدت تک بھگت سکو گے جس کا تم تصور تک نہیں کر سکتے، اور کسی سخت سے سخت عذاب سے بھی تمہیں موت نہ آئے گی۔ آج تم سوچ نہیں سکتے کہ کوئی بوڑھا جوان ہو جائے، کبھی بیمار نہ ہو، کبھی اس پر بڑھاپا نہ آئے اور ہمیشہ ہمیشہ وہ ایک ہی عمر کا جوان رہے۔ مگر یہاں جوانی پر بڑھاپا ہمارے بنائے ہوئے قوانینِ حیات ہی کے مطابق تو آتا ہے۔ کل ہم تمہاری زندگی کے لیے کچھ دوسرے قوانین بنا سکتے ہیں جن کے مطابق جنت میں جاتے ہی ہر بوڑھا جوان ہو جائے اور اس کی جوانی تندرستی لازوال ہو۔

۲۷؎ یعنی تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ پہلے تم کیسے پیدا کیے گئے تھے۔ کس طرح باپ کی صُلب سے وہ نطفہ منتقل ہوا جس سے تم وجود میں آئے۔ کس طرح رحمِ مادر میں، جو قبر سے کچھ کم تاریک نہ تھا، تمہیں پرورش کر کے زندہ انسان بنایا گیا۔ کس طرح ایک ذرّہ بے مقدار کو نشو و نما دے کر یہ دل و دماغ، یہ آنکھ کان اور یہ ہاتھ پاؤں اس میں پیدا کیے گئے اور عقل و شعور، علم و حکمت، صنعت و ایجاد اور تدبیر و تسخیر کی یہ حیرت انگیز صلاحیتیں اس کو عطا کی گئیں۔ کیا یہ معجزہ مُردوں کو دوبارہ جِلا اٹھانے سے کچھ کم عجیب ہے؟ اس عجیب معجزے کو جب تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور خود اس کی زندہ شہادت کے طور پر دنیا میں موجود ہو تو کیوں اس سے یہ سبق نہیں لیتے کہ جس خدا کی قدرت سے یہ معجزہ شب و روز رونما ہو رہا ہے اسی کی قدرت سے زندگی بعد موت اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا معجزہ بھی رُونما ہو سکتا ہے؟

۲۸؎ اُوپر کا سوال لوگوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساختہ و پرداختہ ہو اور اسی کی تخلیق سے وجود میں آئے ہو۔ اب یہ دوسرا سوال انہیں اِس دوسری اہم حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ جس رزق پر تم پلتے ہو وہ بھی اللہ ہی تمہارے لیے پیدا کرتا ہے۔ جس طرح تمہاری پیدائش میں انسانی کوشش کا دخل اِس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ تمہارا باپ تمہاری ماں کے اندر نطفہ ڈال دے

برسانے والے ہم ہیں؟[۲۹] ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں،[۳۰] پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟[۳۱]

اسی طرح تمہارے رزق کی پیداوار میں بھی انسان کی کوشش کا دخل اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے کہ کسان کھیتی میں بیج ڈال دے۔ زمین جس میں یہ کاشت کی جاتی ہے، تمہاری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اس زمین کو روئیدگی کی صلاحیت تم نے نہیں بخشی ہے۔ اس میں وہ مادّے جن سے تمہاری غذا کا سامان بہم پہنچتا ہے، تم نے فراہم نہیں کیے ہیں۔ اس کے اندر جو بیج تم ڈالتے ہو ان کو نشوونما کے قابل تم نے نہیں بنایا ہے۔ ان بیجوں میں یہ صلاحیت کہ ہر بیج سے اُسی نوع کا درخت پھوٹے جس کا وہ بیج ہے، تم نے پیدا نہیں کی ہے۔ اس کاشت کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کرنے کے لیے زمین کے اندر جس عمل اور زمین کے اوپر جس ہوا، پانی، حرارت، برودت اور موسمی کیفیت کی ضرورت ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی تمہاری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کی قدرت اور اسی کی پروردگاری کا کرشمہ ہے۔ پھر جب تم وجود میں اسی کے لانے سے آئے ہو، اور اسی کے رزق سے پل رہے ہو، تو تم کو اس کے مقابلہ میں خود مختاری کا، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کا حق آخر کیسے پہنچتا ہے؟

اس آیت کا ظاہر استدلال تو توحید کے حق میں ہے، مگر اس میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس پر اگر آدمی تھوڑا سا مزید غور کرے تو اسی کے اندر آخرت کی دلیل بھی مل جاتی ہے۔ جو بیج زمین میں بویا جاتا ہے وہ بجائے خود مُردہ ہوتا ہے، مگر زمین کی قبر میں جب کسان اس کو دفن کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر وہ نباتی زندگی پیدا کر دیتا ہے جس سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں شانِ بہار دکھاتی ہیں۔ یہ بے شمار مُردے ہماری آنکھوں کے سامنے آئے دن قبروں سے جی جی کر اُٹھ رہے ہیں۔ یہ معجزہ کیا کچھ کم عجیب ہے کہ کوئی شخص اُس دوسرے عجیب معجزے کو ناممکن قرار دے جس کی خبر قرآن ہمیں دے رہا ہے، یعنی انسانوں کی زندگی بعد موت۔

۲۹؎ یعنی تمہاری بھوک مٹانے ہی کا نہیں، تمہاری پیاس بجھانے کا انتظام بھی ہمارا ہی کیا ہوا ہے۔ یہ پانی جو تمہاری زندگی کے لیے روٹی سے بھی زیادہ ضروری ہے، تمہارا اپنا فراہم کیا ہوا نہیں ہے بلکہ اسے ہم فراہم کرتے ہیں۔ زمین میں یہ سمندر ہم نے پیدا کیے ہیں۔ ہمارے سورج کی گرمی سے ان کا پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے۔ ہم نے اس پانی میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ ایک خاص درجہ حرارت پر وہ بھاپ میں تبدیل ہو جاتے۔ ہماری

ہوائیں اسے لے کر اٹھتی ہیں۔ ہماری قدرت اور حکمت سے وہ بھاپ جمع ہو کر بادل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارے حکم سے یہ بادل ایک خاص تناسب سے تقسیم ہو کر زمین کے مختلف خطوں پر پھیلتے ہیں تاکہ جس خطۂ زمین کے لیے پانی کا جو حصہ مقرر کیا گیا ہے وہ اس کو پہنچ جائے۔ اور ہم بالائی فضا میں وہ برودت پیدا کرتے ہیں جس سے یہ بھاپ پھر سے پانی میں تبدیل ہوتی ہے۔ ہم تمہیں صرف وجود میں لا کر ہی نہیں رہ گئے ہیں بلکہ تمہاری پرورش کے یہ سارے انتظامات بھی ہم کر رہے ہیں جن کے بغیر تم جی نہیں سکتے۔ پھر ہماری تخلیق سے وجود میں آ کر، ہمارا رزق کھا کر اور ہمارا پانی پی کر یہ حق تمہیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ہمارے مقابلہ میں خود مختار بنو، یا ہمارے سوا کسی اور کی بندگی بجا لاؤ؟

۳۰؎ اس فقرے میں اللہ کی قدرت و حکمت کے ایک اہم کرشمے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو حیرت انگیز خواص رکھے ہیں، ان میں سے ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر خواہ کتنی ہی چیزیں تحلیل ہو جائیں، جب وہ حرارت کے اثر سے بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے تو ساری آمیزشیں نیچے چھوڑ دیتا ہے اور صرف اپنے اصل آبی اجزاء کو لے کر ہوا میں اڑتا ہے۔ یہ خاصیت اگر اس میں نہ ہوتی تو بھاپ میں تبدیل ہوتے وقت بھی وہ سب چیزیں اس میں شامل رہتیں جو پانی ہونے کی حالت میں اس کے اندر تحلیل شدہ تھیں۔ اس صورت میں سمندر سے جو بھاپیں اٹھتیں ان میں سمندر کا نمک بھی شامل ہوتا اور ان کی بارش تمام روئے زمین کو زمینِ شور بنا دیتی۔ نہ انسان اُس پانی کو پی کر جی سکتا تھا، نہ کسی قسم کی نباتات اس سے اُگ سکتی تھی۔ اب کیا کوئی شخص دماغ میں ذرا سی بھی عقل رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اندھی بہری فطرت سے خود بخود پانی میں یہ حکیمانہ خاصیت پیدا ہو گئی ہے؟ یہ خاصیت، جس کی بدولت کھاری سمندروں سے صاف ستھرا میٹھا پانی کشید ہو کر بارش کی شکل میں برستا ہے اور پھر دریاؤں، نہروں، چشموں اور کنوؤں کی شکل میں آب رسانی و آب پاشی کی خدمت انجام دیتا ہے، اس بات کی صریح شہادت فراہم کرتی ہے کہ ودیعت کرنے والے نے پانی میں اِس کو خوب سوچ سمجھ کر بالارادہ اِس مقصد کے لیے ودیعت کیا ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ مخلوقات کی پرورش کا ذریعہ بن سکے۔ جو مخلوق کھاری پانی سے پرورش پا سکتی تھی وہ اُس نے سمندر میں پیدا کی اور وہاں وہ خوب جی رہی ہے۔ مگر جس مخلوق کو اس نے خشکی اور ہوا میں پیدا کیا تھا اس کی پرورش کے لیے میٹھا پانی درکار تھا اور اس کی فراہمی کے لیے بارش کا انتظام کرنے سے پہلے اس نے پانی کے اندر یہ خاصیت رکھ دی کہ گرمی سے بھاپ بنتے وقت وہ کوئی ایسی چیز لے کر نہ اڑے جو اس کے اندر تحلیل ہو گئی ہو۔

کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، اس کا درخت[۳۲] تم نے پیدا کیا ہے، یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اُس کو یاد دہانی کا ذریعہ[۳۳] اور حاجت مندوں[۳۴] کے لیے سامانِ زیست

۳۱؎ بالفاظِ دیگر کیوں یہ کفرانِ نعمت کرتے ہو کہ تم میں سے کوئی اس بارش کو دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتا ہے، اور کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ سمندر سے بادلوں کا اٹھنا اور پھر آسمان سے پانی بن کر برسنا ایک فطری چکر ہے جو آپ سے آپ چلا جا رہا ہے، اور کوئی اسے خدا کی رحمت سمجھتا بھی ہے تو اُس خدا کا اپنے اوپر یہ حق نہیں مانتا کہ اُسی کے آگے سرِ اطاعت جھکائے؟ خدا کی اتنی بڑی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہو اور پھر جواب میں کفر و شرک اور فسق و نافرمانی کرتے ہو؟

۳۲؎ درخت سے مُراد یا تو وہ درخت ہیں جن سے آگ جلانے کے لیے لکڑی فراہم ہوتی ہے۔ یا مَرخ اور عفار نامی وہ دو درخت ہیں جن کی ہری بھری ٹہنیوں کو ایک دوسرے پر مار کر قدیم زمانے میں اہلِ عرب آگ جھاڑا کرتے تھے۔

۳۳؎ اِس آگ کو یاد دہانی کا ذریعہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو ہر وقت روشن ہو کر انسان کو اُس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ اگر آگ نہ ہوتی تو انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے مختلف نہ ہو سکتی۔ آگ ہی سے انسان نے حیوانات کی طرح کچی غذائیں کھانے کے بجائے ان کو پکا کر کھانا شروع کیا اور پھر اس کے لیے صنعت و ایجاد کے نئے نئے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا وہ ذرائع پیدا نہ کرتا جن سے آگ جلائی جا سکے، اور وہ آتش پذیر مادے پیدا نہ کرتا جو آگ سے جل سکیں، تو انسان کی ایجادی صلاحیتوں کا قفل ہی نہ کھلتا۔ مگر انسان یہ بات فراموش کر گیا ہے کہ اس کا خالق کوئی پروردگارِ حکیم ہے جس نے اسے ایک طرف انسانی قابلیتیں دے کر پیدا کیا تو دوسری طرف زمین میں وہ سر و سامان بھی پیدا کر دیا جس سے اس کی یہ قابلیتیں رُو بعمل آ سکیں۔ وہ اگر غفلت میں مدہوش نہ ہو تو تنہا ایک آگ ہی اسے یہ یاد دلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ کس کے احسانات اور کس کی نعمتیں ہیں جن سے وہ دنیا میں متمتع ہو رہا ہے۔

۳۴؎ اصل میں لفظ مُقوِین استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف معنی اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ بعض اسے صحرا میں اترے ہوئے مسافروں کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض اس کے معنی بھوکے آدمی کے لیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مُراد وہ سب لوگ ہیں جو آگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خواہ وہ کھانا پکانے کا فائدہ ہو یا روشنی

بنایا ہے۔

پس اے نبی، اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۳۵ ع

کا یا نپش کا

۳۵ یعنی اس کا مبارک نام لے کر یہ اظہار و اعلان کرو کہ وہ اُن تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو کفار و مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو کفر و شرک کے ہر عقیدے اور منکرینِ آخرت کے ہر استدلال میں مضمر ہیں۔

ضروری تصحیح

اشاعت گزشتہ میں صفحہ ۲۸۵ پر تفسیر سورۂ رحمٰن میں آیات ۶۸-۶۹ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔ براہِ کرم عبارت کو اس طرح درست کر لیں:

دونوں باغوں میں دو چشمے فوّاروں کی طرح اُبلتے ہوئے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ اُن میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟